ناولٹ

ریاض عاقب کوہلر

دو اور دو ایک کم پانچ

''بیٹا......! اگر سبزی بیچنے میں شرم محسوس کرتے ہو تو پکوڑے سموسے تلنا شروع کردو۔ بزازی کی دکان کھول لینا بڑا منافع ہوتا ہے۔ سگریٹ تمباکو اور نسوار کا کھوکا بھی ڈال سکتے ہو۔ میں تجھے سگریٹ پینے سے منع نہیں کروں گا، مجھے بھی مفت مل جایا کرے گی، اپنے خاندان کے گاہک ہی تیرے لیے کافی ہوں گے۔ تم فلموں، گانوں کی آڈیو، وڈیو، سی ڈیز بیچ کر ملک کو روشن خیالی کے راستے پر چلنے میں مدد دے سکتے ہو؟...... نائی، موچی کا کام سیکھ لو تو لاکھوں میں کھیلو گے۔ حلیہ بدل کر بھیک مانگنے جیسا مقدس پیشہ اختیار کر سکتے ہو۔ صرف کپڑے بدلنے کی ضرورت پڑے گی، شکل تمھاری یوں بھی بھک منگوں جیسی ہے۔ تم میں ایک کامیاب سیاستدان اور اچھا ٹھیکیدار بننے کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ یعنی تعلیم تیری نہ ہونے کے برابر ہے، وعدہ خلافی میں تم عار محسوس نہیں کرتے اور سب سے بڑھ کر جھوٹ بولنے کے ماہر ہو، جبکہ سچ بولنے سے تیری جان جاتی ہے۔ کیا خوب کہا ہے کسی شاعر نے۔

جھوٹ بولے بھی تو سچ لگتا ہے
ایسے انداز میں وہ بکتا ہے

اس لیے میری مانو تو فوج میں بھرتی ہونے کا خیال دل سے نکال دو۔ مجھے دیکھو شاعر اور شوہر تک بننا گوارا کر لیا، لیکن باپ دادا کے نقش قدم سے نہ ہٹا۔ وہ بھی اس بات کو معیوب سمجھتے تھے کہ بندہ فوجی بن جائے۔ خدا مغفرت فرمائے ابا حضور کی، فرمایا کرتے تھے، فوجی کھڑے ہو کر وہ کام کرتے ہیں جو بیٹھ کر کرنا چاہیے، بیٹھ کر وہ کرتے ہیں جو لیٹ کر کرنا چاہیے اور لیٹ کر وہ کرتے ہیں جو کرنا ہی نہیں چاہیے۔ اپنے جیتے جی میں تجھے زندہ درگور ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ کام تمھارے یوں بھی ایسے ہیں، کہ تمھاری موت سے صرف ابلیس ہی کو دکھ پہنچے گا کہ ایک کارآمد نمائندہ بے کار ہوا۔ اس لیے یہ تصور اپنے دماغ سے نکال دو۔ ورنہ یہ جو تو عمر دراز مانگ کر لایا ہے نا چار دن؟...... فوج میں پانچواں دن ثابت ہوگی۔" یہ سارا لیکچر مجھے ابا کی زبانی اس وقت سننے کو ملا جب میں نے فوج میں بھرتی ہونے کا ارادہ ظاہر کیا۔

"مگر ابا!...... گاؤں کے کتنے ہی آدمی فوج میں بھرتی ہوئے ہیں۔ ان میں سے تو کوئی بھی نہیں مرا سوائے فضلو قصائی کے بیٹے کے۔ اور وہ بھی چھٹی آتے وقت مرا تھا۔"

"ہاں۔" ابا نے ٹھنڈی سانس لی۔ "ریل گاڑی کو ہاتھ دے کر روکنے کی کوشش کر رہا تھا غریب۔ جب دو گاڑیاں رکے بغیر گزرتی چلی گئیں تو تیسری کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ کہ ہاتھ کے اشارے سے تو روکتے نہیں اس طرح تو روکیں گے۔ بوری میں بھر کر لائے تھے بے چارے کو۔ کیا جوان تھا۔ بھینس کو بھی بکری کی طرح گرا کر ذبح کر لیتا اور اس کا چمڑا مرغی کی طرح بغیر چھری کے اتار لیتا تھا۔ آہ...... " ابا نے ایک اور ٹھنڈی سانس بھری۔ "مکان کی دیواریں بناتے وقت ساری مٹی باپ نے اس کی پیٹھ پر بورا رکھ کر ڈھوئی تھی۔"

"مگر اس میں سارا قصور تو اس کی عقل کا ہوا نا؟...... فوج کا کیا قصور؟"

ابا نے مجھے ملامت بھری نظروں سے گھورا۔ "تو تیرا کیا خیال ہے؟ فوج بندے میں عقل چھوڑ دیتی ہے۔؟ تو نے وہ کہاوت نہیں سنی کہ بے وقوفانہ حرکت یا تو فوجی کرتے ہیں یا پھر ریٹائرڈ فوجی۔"

"مگر ابا!...... چاروں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں اور سب انسان بھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔"

"فوجی ہوتے ہیں کمبخت...... اور انگلیاں ایک ہاتھ میں پانچ ہوتی ہیں چار نہیں، ابھی سے فوجیوں کی طرح گفتگو کرنے لگ گیا ہے؟"

”پانچواں انگوٹھا ہوتا ہے جو صرف لڑکیوں کے کام آتا ہے۔ لڑکوں کو دکھانے کے لیے...... البتہ مغربی اقوام اس کی مدد سے مفت سفر کرسکتی ہیں۔“

”آج کل دکھاتی ہوں گی۔“ ابا نے گال پر ہاتھ پھیرا۔ ”ہمارے وقتوں میں پورا ہاتھ دکھاتی تھیں۔ کبھی کبھی نشان بھی بن جاتا تھا، اگر بندے نے تازہ تازہ شیو کی ہوتی۔ اور اگر ان کو پتا چل جاتا، کہ چھیڑنے والا فوجی ہے۔ تو پھر خود کچھ نہیں کہتی تھیں، دائیں بائیں موجود حضرات کو موقع دیتی تھیں۔“

”مگر ابا......! یہ میرا شوق ہے۔ میں اپنے ملک کی سرحد پر دشمن کا سامنا کرتے ہوئے اس کے دانت کھٹے کرنا چاہتا ہوں۔ اسے نیست و نابود کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی بربادی کا تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں۔“

میرا لہجہ جوشیلا تھا مگر آواز دھیمی، کیونکہ ابا شاعرانہ مزاج رکھنے کے باجود غیر شاعرانہ سراپے کے مالک ہیں۔ غصے میں آکر اشاروں کی زبان میں سمجھانا شروع کردیتے ہیں جس میں ہاتھ پاؤں کا بے دریغ استعمال کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں گونگوں اور جانوروں کے علاوہ بھی میں نے اس زبان کو مفید پایا ہے۔ بشرطیکہ انسان کو اس کے استعمال میں مہارت ہو۔ ابا کی اسی عادت کی وجہ سے بھائی جان کافی دور سے جیب خرچ مانگتے ہیں اور اگر کسی دن ابا کہہ دیتے کہ لے لو تو جواب ملتا ادھر ہی پھینک دو۔ یہ ہماری احتیاط کس وجہ سے؟ بقول علامہ اقبال۔

ع سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

ایک دن کمرے کے اندر جیب خرچ مانگ لیا تھا۔ جب کہ ابا دروازے والی سائیڈ پر تھے۔ ویسے آپس کی بات ہے ایک دن میں نے بھی جیب خرچ مانگا تھا۔ بعد میں مجھے پتا چل گیا کہ یہ فضول خرچی ہے۔ ابا نے سمجھایا ہی اس دل نشین انداز اور دلچسپ پیرائے میں تھا کہ بات فوراً دماغ میں بیٹھ گئی تھی۔ ابا کا فرمان ہے کہ بندہ یا تو مار لگانے سے سمجھ جاتا ہے۔ یا پھر زیادہ مار لگانے سے۔ اس لیے وہ سمجھا کر ہی چھوڑتے ہیں۔ جو لوگ بات دیر سے سمجھتے ہیں ابا ان کو دیر تک سمجھاتے رہتے ہیں۔ ایک دن تایا جان ہمارے گھر آئے اس وقت ابا چھوٹے بھائی کے ذہن نشین کوئی بات کرا رہے تھے۔ تایا جان نے آتے ہی اسے چھڑایا اور ابا کو سرزنش کی کہ اس طرح تھپڑوں اور لاتوں سے بچوں کو مارنا اچھی بات نہیں ہے۔ خبردار آئندہ ایسا نہ کرنا۔ اور ابا نے ان کی بات مان لی۔ اس لیے

آج کل ابا تھپڑوں اور لاتوں کی بجائے جوتوں سے کام لیتے ہیں۔

''سبزی سپلائیر بن جاؤ...... پاکستان کے سارے لیموں بھارت برآمد کر دینا ان کے دانت خود بخود کھٹے ہو جائیں گے۔ان کی بربادی کا تماشا دیکھنے کے لیے 1965 کی جنگ پر بنی ہوئی فلمیں دیکھو۔اور انھیں نیست و نابود کرنے کے لیے ان کے اعمال کافی ہیں تمھیں بھرتی ہونے کی ضرورت نہیں۔'' ابا نے نہایت اطمینان سے میرے دلائل کا رد کیا۔

''مگر آپ کے بتائے ہوئے کام میرے جی کو نہیں لگے؟''

''یہ تو میں نے بطور مثال بتلائے ہیں۔تم جی لگتا کام کر لو۔جتنی رقم سودا سلف کے پیسوں سے چرا کر جوئے میں اڑاتے ہو، وہ کسی ضرورت مند کو سود پر دے سکتے ہو۔ان پیسوں سے چرس خرید کر بھی دگنے منافع پر بیچ سکتے ہو۔چرسیوں کو''پاؤڈر'' کی لت لگا لو تو سونے پہ سہاگہ۔کسی ڈکیتی گینگ میں شمولیت اختیار کر لو تو دولت مند بننے کے ساتھ، مستقبل میں قومی اسمبلی کے ممبر بننے کے چانس بھی روشن ہو جائیں گے۔''

''اگر آپ پتا ہے، کہ میں سودا سلف کے خرچ سے پیسے چرا کر جوا کھیلتا ہوں۔تو سودا سلف کی خریداری کے لیے آپ کسی اور بھائی کو بھیج دیا کریں۔'' میں نے بحث کا رخ بدلا۔

''سب کو آزما چکا ہوں، تمام کم بخت سودا سلف کے پیسوں کو جیب خرچ سمجھتے ہیں۔جبکہ تو کچھ سامان تو لے آتا ہے۔''

ہم کافی سے بھی زیادہ بھائی ہیں۔اور جاننے والے ابا کے کاروبار کے متعلق اس طرح پوچھتے ہیں، کہ اس کے علاوہ آپ کیا کرتے ہیں۔حالانکہ جب ابا نے شادی کی تو تین سال تک ان کی کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔بڑی منتوں مرادوں کے بعد بھائی جان پیدا ہوا تھا۔ابا کہتے ہیں پڑوسیوں کا ایک چھوٹا سا بچہ ہمارے گھر آیا کرتا۔اس کی توتلی زبان سے گالیاں سن کر ابا ان کے دل میں بچے کی حسرت مزید بڑھ گئی اور ایک دن انھوں نے جائے نماز بچھا کر دو رکعت نماز صلواۃ الحاجت پڑھ کر دعا مانگی۔

گز بھر لمبی زبان ہو جس کی میرے خدا

اس طرح کا بیٹا کوئی ہم کو بھی ہو عطا

اور اللہ تعالیٰ نے اس سے بھی زیادہ خوبیوں والا بیٹا عطا کیا۔ بھائی جان کی زبان ڈیڑھ گز لمبی ہے، گز بھر غیروں کے لیے اور آدھا گز گھر والوں کے لیے، اسی خوبی کی بنا پر وہ آسانی سے پولیس میں بھرتی ہو گیا تھا۔ اس سے دو چھوٹے کاشتکاری سے منسلک ہیں ان کے بعد والا بے روزگار اور پھر میں بھی فارغ ہی ہوں ۔ مجھ سے چھوٹے تین پڑھ رہے ہیں۔ ان سے ایک چھوٹا سکول داخل ہونے کے قابل نہیں ہے اور ایک آنے والا ہے۔ اب آپ خود اندازہ لگا لیں، میرا احساب کا پیپر ویسے ہی فیل ہے۔

"ابا اللہ نے آپ کو اتنے بیٹے دیے ہیں کہ آپ انگلیوں پر بھی نہیں گن سکتے پھر ان میں ایک نہ سہی...... ہونے دیں بھرتی آپ کا کیا جاتا ہے؟" میں نے ابا سے فاصلہ بڑھا کر جرح کی۔

ابا آبدیدہ ہو گیا۔ "یہی بات کافی عرصہ ہوا میں نے بھی تمہاری ماں سے کہی تھی کہ اتنے ہیں چند خرکاروں کو بیچ دیتے ہیں یا اونٹ کی ریس کے لیے بھجوا دیتے ہیں، عرب ممالک میں۔ وہ بھی اچھے دام دے رہے ہیں۔ مگر تمہاری اماں سمجھتی ہی نہیں رونے لگی نیک بخت۔ حالانکہ انھوں نے کون سا تمھیں ذبح کر دینا تھا۔ کھانا، پینا، کپڑے اور رہائش ان کے ذمہ ہوتی۔ اور کیا چاہیے آرام دہ زندگی کے لیے۔ ہمارے بھی وارے نیارے ہو جاتے اور تم لوگ بھی ٹھکانے لگ جاتے۔"

"پھر اب کیوں ڈر رہے ہیں آپ؟...... فوج نے بھی تو مجھے ذبح نہیں کر دینا۔ اسی طرح کھانا پینا کپڑے اور رہائش بھی وہ مہیا کرتے ہیں۔"

"بات مرنے کی نہیں......؟ عقلمندی اور بیوقوفی کی ہے۔ سمجھداری اور ناسمجھی کی ہے۔ سیانے کہتے ہیں کہ عقل کی تو حد ہوتی ہے بے عقلی کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ اور میں تمھاری محدود عقل کو جو پہلے ہی بہت کم ہے ختم نہیں کرنا چاہتا۔ لوگ پہلے ہی پیٹھ پیچھے ہنستے ہیں بعد میں قہقہے لگائیں گے اور وہ بھی منہ پر۔"

"ضروری تو نہیں کہ ہر فوجی کے پیچھے باتیں ہوں اس کی زندہ مثال آپ کا دوست ریٹائرڈ فوجی حوالدار بشیر ہے کہ جس کے پیچھے آپ جیسے غیبت بیاں نے بھی کبھی بات نہیں کی ہے۔"

"اس کے بارے مجھے ایک ایسی بات معلوم ہے کہ اس کے سامنے میں حق نہیں کہہ سکتا۔ اور پیٹھ پیچھے خطرہ ہے کوئی اسے بتا نہ دے، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔"

"کون سی بات؟" میرے لہجے میں حیرانی تھی۔

'ریٹائرڈ ہوتے ہی اس نے بارہ بور بندوق خرید لی ہے مع تین درجن کارتوسوں کے۔" ابا نے سنسنی خیز لہجے میں انکشاف کیا۔

"لیکن آپ تو کہتے ہیں کہ کسی بھی بندوق سے بندہ صرف اس وقت زخمی یا ہلاک ہوسکتا ہے، جب چلانے والا فوجی یا ریٹائرڈ فوجی نہ ہو۔"

"آج پھر بھنگ پی ہے تو نے؟" ابا نے اچانک غیر متعلق سوال کیا۔

"ن... نن...... نہیں..نہیں تو۔" میں گڑبڑا گیا۔"یہ بھنگ کا تذکرہ کہاں سے آ گیا بیچ میں؟"

ابا نے پوچھا۔"جب تو نے بھنگ بھی نہیں پی۔اور ابھی تک بھرتی بھی نہیں ہوا تو پھر ایسی باتیں کر کے کیا ثابت کرنا چاہتا ہے؟"

"کیسی باتیں؟"

"یہی نشانے والی باتیں اور کون سی......؟ اگر تیرے پاس وہ چیز ہوتی جو سکھوں کے پاس نہیں ہوتی تو تُو کبھی بھی یہ بات نہ کرتا۔ بیوقوف...... بارہ بور بندوق کے کارتوس میں چھرے بھرے ہوتے ہیں، جس سے نشانہ لینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔اور کوئی نہ کوئی چھرہ لگ ہی جاتا ہے۔ٹھاہ ہونے کے بعد۔البتہ تھری ناٹ تھری یا اسی قسم کی کوئی دوسری بندوق ہوتی جس کے کارتوس میں سنگل بلٹ ہوتا ہے تو مجھے کوئی فکر نہ ہوتی۔"

ہونہہ! فکر...... کھانا اس کے ذمے، پینا پلانا اس کی ذمہ داری، سگریٹ حقے کا خرچا اس کے نام پھر فکر کس بات کی؟"

"کھوتی کے بچے!" ابا نے غصے میں انکشاف کیا...... کافی لوگ مجھے گالی دیتے وقت اول الذکر جانور کے مذکر کے ساتھ میرا رشتا جوڑتے ہیں ابا نے مونث استعمال کر کے یہ بات تو کنفرم کر دی کہ میری ولادت میں مونث اور مذکر دونوں مذکورہ جانور ہی استعمال ہوئے ہیں۔البتہ میری اپنی ذات ابھی تک زیرِ غور ہے۔

"اس کی باتیں کون سنتا ہے دن بھر؟" ابا کی بات جاری رہی۔"اگر عمر قید کے مجرموں کو بھی حوالدار بشیر کی باتیں سننے کی شرط پہ رہائی دی جائے، تو وہ ایسی آزادی پر کال کوٹھڑی کو ترجیح دیں گے۔غضب خدا کا ہر وقت اسے پکارتے وقت حوالدار صاحب، سرجی اور سرکار کہنا۔پرسوں ہی کی بات ہے...... رحمو کمہار نے اسے ماموں کہہ

دیا۔تو کہنے لگا میری تو دو ہی بہنیں ہیں۔ایک بھاگ گئی تھی ٹرک ڈرائیور کے ساتھ اور دوسری اڈاہ چلاتی ہے۔تم کون سی سے ہو؟......رحیمو کمہار نے کہہ دیا پہلے والی سے۔پھر تو وہ ہتھے سے اکھڑ گیا اور رحیمو کمہار پر گولی داغ دی۔یہ تو ہماری خوش قسمتی تھی کہ رائفل ان لوڈ تھی ورنہ رحیمو کمہار کے ساتھ ہم بھی رگڑے جاتے۔کیونکہ اس کے ساتھ ہی بیٹھے تھے۔اور جب تک وہ گھر سے یعنی اپنی گھر والی سے رائفل لوڈ کروا کر لاتا ہم سب محفوظ ٹھکانوں پر منتقل ہو چکے تھے اور جہاں تک تعلق ہے کھانے پینے کا وہ تو جیل میں بھی ملتا ہے اس کا مطلب ہے جیلوں میں بے فکرے بھرے پڑے ہیں؟"

"پھر آپ لوگ ایسے خرمغز، میرا مطلب ہے فوجی دماغ بندے کے پاس بیٹھتے کس لیے ہو...... جہاں پر ہر وقت جان کا خطرہ اور عقل کے نقصان کا خطرہ رہتا ہے؟"

"یہی بات سوچ کر اپنے پڑوسی رمضو نے بھی وہاں آنا ترک کر دیا تھا۔تیسرے دن حوالدار بشیر اس کے گھر لوڈ شدہ رائفل کے ہمراہ پہنچ گیا اور کہنے لگا۔

"سنا ہے تو میرے پیچھے باتیں کرتا ہے۔اور مجھے بیوقوف سمجھتا ہے۔رمضو نے قسم کھا کر بتایا کہ وہ اسے بالکل بیوقوف نہیں سمجھتا۔اور نہ کہتا ہے۔اس کی بات میں صداقت بھی تھی۔کیونکہ وہ اسے بیوقوف نہیں پاگل سمجھتا ہے۔حوالدار نے پوچھا۔

"پھر تم آتے کیوں نہیں؟اس کا مطلب تو صریحاً یہی بنتا ہے یہ لاسٹ وارننگ ہے۔اگلی مرتبہ میں بندوق کی زبان میں بات کروں گا۔...... بیٹے! وہ تو سوچتا بھی بندوق سے ہے۔عقل اگر بازار میں ملتی تو بھی اس نے نہیں لینی تھی۔یہ سوچ کر کہ کام تو اس کے بغیر بھی چل جاتا ہے۔پھر اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

"بہر حال بھرتی تو میں نے ہر صورت ہونا ہے۔"میں نے ابا سے فاصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔"چاہے آپ مجھے اجازت دیں یا نہ دیں۔"

"میں تجھے عاق کر دوں گا"

"کر دیں۔"میں اطمینان سے بولا۔"جو جائیداد آپ نے ہمارے لیے چھوڑ کر جانی ہے،اس سے وہ قرضہ جات کئی گنا زیادہ ہیں جن کی آپ نے ادائی کرنی ہے۔اور آپ کی زندگی میں تو یہ ناممکن ہے۔ظاہر ہے مرنے

کے بعد پسماندگان ہی پھنسیں گے، بڑے بھائی تو خود آپ کی ولدیت سے خارج ہونے کے چکر میں ہیں۔"

"تم سراسر بکواس کر رہے ہو۔" ابا غصے میں دھاڑا "اگر میں نے قرضے دینے ہیں تو لینے بھی تو ہیں نا۔"

"ہم کو معلوم ہے قرضوں کی حقیقت لیکن۔" میں آہستہ سے گنگنایا۔

"کیا معلوم ہے تمھیں؟...... مسخری کرتا ہے میرے ساتھ سور کی تھوتھنی۔"

ابا کا موڈ بدلتا دیکھ کر میں چپ ہو گیا، مجھے احساس ہو گیا تھا کہ جذبات میں آ کر میرے منہ سے سچی باتیں نکلنے لگیں ہیں۔ اتفاق سے ابا کے مقروضوں کا مجھے معلوم تھا، پچھلے دنوں میرے سامنے اللہ بخش ٹھیکیدار سے 1500 روپے ادھار مانگے، اس نے کہا......

"میرے پاس فی الحال 500 روپے ہیں یہی رکھ لو باقی بعد میں لے لینا۔"

ابا نے رقم اس سے لے کر ایک رجسٹر میں کچھ یوں اندراج کیا......

اللہ بخش ٹھیکیدار دینے ہیں : 500 روپے۔

اللہ بخش ٹھیکیدار لینے ہیں : 1000 روپے۔

اللہ بخش ٹھیکیدار کے ذمہ بقایا بچے : 500 روپے۔

مجھے خاموش پا کر ابا دوبارہ بولا۔ "مجھے اپنا باپ نہ سہی اپنی ماں کا میاں سمجھ کر ہی صحیح بات بتا دے، کہ فوج میں بھرتی ہونے کے لیے تو اتنا بے کل کیوں ہے؟ لیکن سچ مچ والا سچ۔ پاکستانی خبروں والا نہیں۔"

"ابا آپ کیسی بات کر رہے ہیں؟" میں قدرے جذباتی لہجے میں بولا۔ "ہمارے حلالی ہونے کے لیے کیا یہ ثبوت کم ہیں۔ کہ جوا ہم کھیلتے ہیں، جھوٹ ہم بولتے ہیں، نماز ہم نہیں پڑھتے، گالیاں ہر قسم کی دینا جانتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کئی کام ایسے ہیں جو آپ جوانی میں کرتے رہے ہیں۔ اور اب بھی نہیں چھوڑے۔ وہ ہم بھی کر رہے ہیں۔ باقی جہاں تک اماں جان کا تعلق ہے۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی میں ایک ہی غلطی کی ہے۔ اور وہ ہے آپ سے شادی کرنا۔"

"تقریر مت جھاڑ میری بات کا جواب دے۔"

"میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

''روکا کس نے ہے؟''

''فوج میں بھرتی ہونا میری محبوبہ کی شرط ہے۔'' میں بے چارگی سے بولا۔ ''بلکہ اس کے ابا کی۔''

''بیوقوف ! اس کے علاوہ بھی کئی لڑکیاں ہوں گی؟...... اوران کو ورغلانے کے بھی کئی طریقے ہیں۔ تو نے خودکشی ضرور کرنی ہے۔ فوج میں صرف جانا ہی نہیں واپس آنا بھی مشکل ہے۔ بندہ جاتا اپنی مرضی سے ہے۔ مگر آ کسی کی مرضی سے بھی نہیں سکتا۔ ہم سے مدد لو تمھیں ہر قسم کی لڑکیاں پھنسانے کے طریقے بتا دیں گے۔''

''بالکل نہیں ابا۔ آپ کی تجویزوں پر عمل کر کے میں اماں ہی کی طرح کی کوئی لڑکی پھنسا سکتا ہوں۔ اور ایسی لڑکیاں آپ ہی کو مبارک ہوں۔ گھر میں ایک ہی اماں کافی ہیں۔ یہ گھر دوسری اماں کا متحمل نہیں ہوسکتا۔''

''اگر فوج میں گیا تو خود ہی بھگتے گا۔'' ابا کا پارہ آہستہ آہستہ چڑھنے لگا۔

''صبح میں نے جانا ہے بھرتی ہونے کے لیے'' میں دروازے کی طرف کھسک کر آہستہ سے بولا۔

''تو نہیں جائے گا۔''

''خدا کی قسم جاؤں گا۔'' میں ہٹ دھرمی سے بولا

''ادھر آنا ذرا قریب تجھے بھیجتا ہوں۔'' ابا کے تیور یک دم بدل گئے اور مجھے بھاگتے ہی بنی۔

☆......☆......☆

وہاں سے میں سیدھا پہلوان ہوٹل پہنچا۔ خدا بخش فارغ البال وہاں مظلومیت کی تصویر بلکہ پورٹریٹ بنا بیٹھا تھا۔ ایک کپ چائے سے خالی اور مکھیوں سے بھرا، اس کے سامنے دھرا تھا۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر بالکل اس مجرم کا تصور ذہن میں ابھرتا تھا جسے پھانسی کی سزا سنائی جا چکی ہو۔ اور رحم کی اپیل سپریم کورٹ نے بھی مسترد کر دی ہو۔

''پھر بچ گئے؟ بڑے خوش قسمت ہو یار۔'' میرے کرسی سنبھالتے ہی وہ بولا۔

''کس سے؟'' میں حیرانی سے مستفسر ہوا۔

''پولیس سے۔ اور اس سے جس کی تم نے جیب کاٹی ہے اور کس سے؟''

بالوں کی طرح تم عقل سے بھی فارغ ہو۔ کسی کے دوڑنے کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ اس کے پیچھے پولیس

لگی ہے۔" میں قدرے غصے سے بولا۔

خدا بخش فارغ البال جسے میں بخشو ویہلا کہتا ہوں "ویہلا" سرائیکی زبان کا لفظ ہے۔ جس کا مطلب اردو میں تقریباً فارغ البال ہی بنتا ہے۔ وہ ماں، باپ، بیوی، بچوں اور سر کے بالوں سے لے کر عقل تک سے فارغ ہے۔ اسے بُرا کام کرنے کی کبھی ضرورت نہیں پڑی۔ کیونکہ بُرا کام اس سے خود بخود ہو جاتا ہے۔ وہ سرتاپا برائی ہے مگر میرا اس وقت کا یار تھا جب ہم لنگوٹی بھی نہیں پہنتے تھے۔

"تو پھر کسی لڑکی کو چھیڑا ہو گا؟ تمھیں پچھلے ہفتے کی مار بھول گئی تھی کیا؟"

"ابّا سے جان چھڑا کر آ رہا ہوں۔" وہ کرسی پر اطمینان سے اس چرسی کے انداز میں بیٹھا ہوا تھا جس کا نشہ پورا چکا ہو میری بات سنتے ہی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"وہ درندہ ادھر تو نہیں آ رہا؟" اُس کی آواز میں لرزش نمایاں تھی۔

"کیا پتا؟" میں مختصراً بولا

"تم پھر بھی اطمینان سے بیٹھ گئے۔ میں تو گیا۔" کہہ کر اس نے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔

"بات سنو، بخشو!...... ٹھہرو۔" میں نے اسے آواز دی مگر وہ آناً فاناً غائب ہو گیا۔ ابا نے ایک دو دفعہ اس کی مزاج پرسی کی تھی۔ مگر ابھی اس کے بھاگنے کی وجہ مکھیوں سے بھرا ہوا کپ تھا۔ جو اس نے لازماً چائے سے بھرا ہوا منگوایا ہو گا۔ اور پیسے اس کے پاس حسب معمول نہیں ہوں گے۔ میرے آنے سے پہلے وہ سو فیصد بل کی ادائی کے بارے سوچ رہا تھا ورنہ اس کے چہرے پر اتنے بھیانک تاثرات نہ ہوتے۔ اسی وجہ سے اس نے چھوٹتے ہی کسی کی جیب کاٹنے کے بارے استفسار کیا تھا۔ اور اگر میں کوئی ایسا کام کر چکا ہوتا تو لازماً میرے پاس پیسے ہوتے اور شاید میں چائے کے ساتھ اسے لنچ کی بھی دعوت دے ڈالتا۔ لیکن میرے بھاگنے کی حقیقت معلوم ہوتے ہی اس نے بھاگ جانا مناسب سمجھا۔ کیونکہ اسے بھی یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ کسی کی جیب کاٹے بغیر میرے پاس اتنے پیسوں کا ہونا جس سے چائے پی جا سکے اتنا ہی ناممکن تھا جتنا کہ زرداری کا سچ بولنا۔ مجھے اپنی فکر لاحق ہو گئی۔ میں نے ادھر سے کھسکنے کا سوچا لیکن تاڑنے والے چیل کی نظر رکھتے ہیں، پہلوان ہوٹل کا پہلوان بیرا فوراً میرے قریب پہنچ گیا۔ کپ لے جاؤں باؤ؟" اُس نے غلیظ کپ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”آں...... ہاں...... ہاں لے جاؤ۔“میں قدرے پریشانی سے بولا اور کرسی پر بخشو والا پوز بنا کر بیٹھ گیا۔اور جہاں سے اس کی سوچ کا سلسلہ ٹوٹا تھا وہیں سے جوڑ دیا کہ ایک کپ کے بدلے کتنے برتن دھونے پڑیں گے اور اگر میں بھی اپنے لیے چائے منگوالوں تو پھر کتنا کام پہلوان لے گا؟۔

”آج ٹوپی بڑی اچھی پہنی ہے باؤ۔“ جیرے پہلوان نے کپ لے جاتے ہوئے میری پی کیپ کی طرف اشارہ کیا۔ میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔اُس کی بات کا صریح مطلب یہی تھا کہ چائے کے کپ کے بدلے وہ میری ٹوپی ہتھیانے کے چکر میں ہے۔اور اس ٹوپی سے دستبرداری میرے لیے اتنی ہی جان لیوا تھی۔ جتنا کسی ایکٹریس کے لیے مکمل لباس پہننا۔ پورے ایک ہفتے ”دلاور شاہ“ شاپنگ سٹور کے چکر لگانے کے بعد میں مذکورالذکر کو چرانے میں کامیاب ہوا تھا، بخشو کے کہنے کے مطابق یہ ٹوپی پہن کر میں بالکل ماسٹر آصف مجتبیٰ کی طرح نظر آتا ہوں جیسا کہ وہ پہلی گیند پر بولڈ ہونے کے بعد لگتا ہے، بلکہ لگتا تھا۔

ایک دفعہ تو میرے ذہن میں آیا کہ پہلوان سے صاف صاف کہہ دوں کہ جب میں نے چائے پی ہی نہیں ہے پھر پے منٹ کیوں کروں؟ لیکن پھر اس کے بیروں کی شکلیں میری نظروں میں گھوم گئیں (جو اُس کے پٹھے بلکہ اُلو کے پٹھے تھے)، جیرے نے تو واضح کہہ دینا تھا کہ......

”خود ہی بھگایا ہے استاد جی! پہلے بھی دو تین دفعہ ایسا کر چکا ہے اور ہم نے در گزر کرتے رہے ہیں لیکن برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔اور منحوس شکل گاما!...... اس نے تو کہنا تھا استاد جی میرے حوالے کرو سارے اگلے پچھلے قرض چکا دے گا اور اس کے بعد کسی پولیس والے کی شہہ پر بھی پہلوان ہوٹل میں ہیرا پھیری کی کوشش نہیں کرے گا۔ جبکہ پہلوان ہوٹل کے کرتا دھرتا تاجے پہلوان کو تو ایسے موقعوں کی تلاش رہتی تھی۔ تاکہ دوسروں کے لیے عبرت کا سامان، بلکہ سماں پیدا ہو۔

میں نے سر جھٹک کر ان بھیانک خیالوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ ایک ناکام کوشش تھی۔ گندے برتنوں سے بھرے باورچی خانے کا تصور اتنا بھیانک تھا کہ میں جھرجھری لے کر رہ گیا۔ اچانک میری نگاہ حوالدار بشیر پر پڑی جو ہوٹل میں داخل ہو کر خالی ٹیبل کی تلاش میں نظریں دوڑا رہا تھا۔ پہلے تو میں اس امید پر بیٹھا رہا کہ شاید وہ ادھر کا رخ کرے لیکن جب وہ مخالف کونے کے جانب مڑا تو میں نے ہانک لگائی۔ ”حوالدار صاب

!''وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹک کر رکا، پھر میری ٹیبل کی سمت بڑھنے لگا۔ میں نے جیب سے میلا سا رومال نکالا اور اس کے لیے ایک کرسی صاف کر کے خوشامدانہ انداز میں بولا۔

''بیٹھیے سر۔''

اس نے بیٹھتے ہی پوچھا۔''ہاں برخوردار!......کیا ہو رہا ہے؟''

''بس سر......یوں ہی بیٹھا ہوں۔'' کہتے ہوئے میں نے بیرے کو آواز دی۔''حوالدار صاب کیلیے دودھ پتی لے آؤ پہلوان جی۔''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔''کیا تم نے نہیں پینی؟''

''سر!......آپ کے روبرو بیٹھ کر کیسے پی سکتا ہوں؟'' میرا لہجہ خوشامدانہ تھا کیونکہ چائے کے کپ کے پیسوں سے جان چھڑانے کے علاوہ بھی میری ایک ضرورت اُس سے پھنسی ہوئی تھی۔ اور وہ ضرورت اُس کی دختر نیک اختر تھی۔ جس سے شادی کے لیے میں فوج جیسی نوکری کرنے کے لیے تیار ہوا تھا۔

''کوئی بات نہیں۔ آج پی لو آئندہ دیکھی جائے گی۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے بیرے کو دوسری دودھ پتی لانے کا بھی کہہ دیا۔ دودھ پتی کافی شاندار بنی تھی۔

''مجھے بلانے کا خیال تجھے کیسے آیا؟'' اُس کا انداز ایسا تھا جیسے پوچھنا چاہ رہا ہو۔''مجھے بلانے کی جرات تجھے کیسے ہوئی؟''

''دراصل! میرا دوست کہہ رہا تھا کہ بڑے افسر مغرور ہوتے ہیں اور کم رتبہ آدمی کے ساتھ بیٹھ کر کھانے پینے سے احتراز برتتے ہیں۔ جبکہ میں نے اسے بتایا کہ سارے افسر ایسے نہیں ہوتے۔ کچھ حوالدار بشیر جیسے بھی ہوتے ہیں۔ غریب پرور اور بااخلاق۔ جو عوام سے بھی گپ شپ کر لیتے ہیں۔''

''شاباش برخوردار'' اُس نے خوش ہو کر قہقہہ لگایا۔

''سر!......اسی لیے آپ کو چائے کی دعوت دینے کی ہمت کی ہے۔'' میں نے مزید مسکہ لگایا۔

''کیوں نہیں......کیوں نہیں......تمھاری پرخلوص دعوت میں نے قبول کر لی۔ ورنہ ہر ایرے غیرے کی دعوت کون قبول کرتا ہے؟''

”لیکن سر!......بخشو تو میرا مذاق اڑا رہا تھا۔ کہ تم کیسے حوالدار بشیر کی دعوت کرو گے؟ جبکہ بڑے افسروں کے ساتھ بندہ جب بھی بیٹھتا ہے تو بل لازماً بڑا افسر ہی ادا کرتا ہے۔“میں نے پینترا بدلا تا کہ لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔

”بات تو اس کی ٹھیک ہے۔“اس نے اپنی بارہ بور رائفل گود سے اٹھا کر ٹیبل کے ساتھ کھڑی کی اور پوچھا ”یہ بخشو کون ہے؟“

”میرا دوست ہے سر!......۔“اتنی آسانی سے کام بنتے دیکھ کر میرے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آ گئی تھی۔”سر!......کیا ابھی میں جا سکتا ہوں؟ آپ کی عزت افزائی کا شکریہ۔آپ نے میری ٹیبل کو رونق بخشی اب میں مزید آپ کا قیمتی ٹائم ضائع کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔“

”ٹھیک ہے......تم جا سکتے ہو۔“اس کے لہجے میں افسرانہ شان تھی۔اور میں نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے دروازے کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

”اوئے!......جاتا کدھر ہے بل کس نے ادا کرنا ہے؟“میں دو تین ہی قدم چلا ہوں گا کہ جیرا پہلوان کسی بھوت کی طرح میرے سامنے نمودار ہوا۔مگر میرے کچھ کہنے سے پہلے حوالدار بشیر نے اسے جھاڑا”کیا بات ہے اوئے نورے کشتر!......میں تمھارے استاد کی شادی اٹینڈ کرنے کے لیے بیٹھا ہوں؟ بے غیرت بیرے تمھیں پتا نہیں جب آفیسر بیٹھے ہوں تو کسی عام آدمی سے بل نہیں مانگا جاتا؟“

جیرا کوئی کرارا سا جواب ضرور دیتا مگر اس کی بدقسمتی کہ حوالدار بشیر نے یہ بات بارہ بور رائفل ہاتھ میں لے کر کہی تھی اور وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔میں نے ہنستے ہوئے باہر کی طرف قدم بڑھا دیے جیرے کی بے عزتی سے مجھے دلی تسکین ملی تھی۔وہ مجھے جاتے دیکھ کر بے بسی سے بولا۔”اتنی اچھی بھی نہیں ہے تیری ٹوپی باؤ۔“

”ہاں انگور ہمیشہ کھٹے ہوتے ہیں؟“میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا اور ہوٹل سے باہر آ گیا۔اب میرے لیے سب سے بڑا مسئلہ صبح شہر جانے کے لیے کرائے کی تلاش تھی۔کیونکہ فوج کی بھرتی صبح سے شروع تھی۔

میں انہی سوچوں میں سرگرداں اپنی گلی میں مڑا،اسی وقت دو چھوٹے لڑکے بھاگتے ہوئے تایا کے گھر سے برآمد ہوئے۔ایک کی بغل میں چادر میں لپٹی ہوئی کوئی چیز تھی۔مجھے سامنے پا کر وہ متغیر چہرے کے ساتھ پیچھے مڑا

مگر میں نے بھاگ کر چادر والے کو پکڑ لیا۔ کیونکہ مجھے دال کی کالک واضح نظر آرہی تھی البتہ خالی ہاتھ بھاگنے میں کامیاب رہا تھا۔

"کیا ہے یہ؟" میں نے چادر اس کی بغل سے کھینچی۔

"یہ۔۔۔۔۔ یہ تاجاں ماسی نے دیا ہے بب بیچنے کے لیے؟" وہ ہکلا گیا۔ تاجاں میری سگی تائی تھی۔ میں نے چادر کو کھولا تو اس میں مرغا لپٹا ہوا تھا۔ مجھے معاملے کی تہہ تک پہنچنے میں دیر نہ لگی۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر تائی کے گھر کی طرف کھینچا......

"چلو تائی کے پاس۔ ابھی پتا چل جاتا ہے۔"

"معاف کر دیں بھائی جان غلطی ہو گئی۔" وہ روتے ہوئے بولا۔ "آئندہ ایسا کچھ نہیں کروں گا۔"

"پھوٹو یہاں سے۔ بے شرم، بے حیا، چوری کرتے غیرت نہیں آتی۔" میں نے اسے دھکا دیا۔ وہ بھاگتے ہوئے وہاں سے غائب ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے بازار کا رخ کیا۔ اگلے آدھے گھنٹے بعد میری میں جیب میں پانچ سو کے نوٹ کڑکڑا رہے تھے۔

☆......☆......☆

صبح منہ اندھیرے اٹھ کر میں نے بھرتی کے لیے جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ نہا دھو کر اپنے سب سے اچھے کپڑے پہنے۔ پولیس والے بھائی کی الماری سے پرفیوم کی بوتل چرا کر کپڑوں پر خوشبو چھڑکی۔ اور گھر سے باہر نکل آیا۔

آدھے گھنٹے بعد میں شہر جانے والی بس سے کسی بیل سے لٹکی توری کی طرح چپٹا شہر کی سمت رواں دواں تھا۔ بس اڈے پر اترتے ہی میں بھرتی آفس کی طرف چل پڑا۔ بھرتی آٹھ بجے شروع ہونا تھی میں ساڑھے سات پہنچ گیا تھا۔ رش کو دیکھ کر مجھے لگا جیسے میلے میں پہنچ گیا ہوں۔ اگر ابا وہاں ہوتا تو ضرور کہتا کہ وہ ملک کبھی ترقی نہیں کر سکتا جس کے اتنے زیادہ جوان فوج میں بھرتی کے شوقین ہوں۔

بھرتی آفس کے گیٹ پر بے تحاشا لمبے قد کا ایک فوجی کھڑا تھا۔ اگر وہ وردی میں نہ ہوتا تب بھی پہچان لیا جاتا کہ فوجی ہے۔ کیونکہ اگر وہ فوجی نہ ہوتا تو لازماً بیٹھ جاتا اس کا قد اتنا لمبا تھا کہ اس کے بیٹھنے پر بھی کھڑے

ہونے کا گمان ہو سکتا تھا۔اسی طرح کے قد کے بارے کسی نے لکھا ہے کہ وہ ریڑھی والے کے پاس پہنچا اور اسے کہنے لگا۔

''آم کس بھاؤ بیچ رہے ہو بھائی؟''

ریڑھی والے نے کہا ''یہ آم نہیں خربوزے ہیں۔''

وہ حیرانی سے بولا''مجھے تو آم لگ رہے ہیں؟''

جواب ملا۔''جہاں سے تم دیکھ رہے وہاں سے تو آم ہی نظر آئیں گے۔ذرا جھک کر دیکھو۔''

شاید بھرتی شروع ہونے تک میرے دماغ میں بھرتی ہونے کا خناس سمایا رہتا۔اگر نوٹس بورڈ پر میری نظر نہ پڑتی، جو کچھ اس قسم کا تھا۔

بھرتی کے خواہش مند افراد کے لیے شرائط......

1۔قد کم سے کم 5 فٹ 9 انچ۔

2 ۔تعلیم کم سے کم میٹرک۔

3۔عمر کم سے کم 17 سال زیادہ سے زیادہ 23 سال۔

4۔شناختی کارڈ یا ڈومیسائل کا ہمراہ ہونا ضروری ہے۔

اس کے علاوہ بھی کافی شرائط لکھی ہوئی تھیں مگر پہلی دونوں نامعقول شرائط دیکھنے کے بعد میں نے مزید ٹائم ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا کہ قد ہمارا نپولین بونا پاٹ جتنا ہے اور تعلیم کسی ممبر اسمبلی جتنی۔

بڑے بھائی جان جن کا قد مجھ سے بھی چند انچ کم ہے فرمایا کرتے ''قد کی بات ہوتی تو اونٹ جرنیل ہوتے۔''لیکن یہ کوئی ایسی دلیل نہیں تھی جسے میں اپنی کوتاہ قامتی کے رد میں پیش کر سکتا میں نے وہاں سے سیدھا سینما کا رخ کیا کہ

ع ''کچھ یادگارِ شہرِ ستم گر ہی لے چلیں۔''

سہ پہر ہونے سے پہلے میں گھر پہنچ گیا کیونکہ بقول ابا۔ ''صبح کا بھولا اگر عصر تک گھر پہنچ جائے تو کوئی مضائقہ نہیں اگر شام ہو جائے تو پھر اگلی صبح کا انتظار کرے کیونکہ اس دن تو کسی نے اسے گھر میں گھسنے نہیں دینا۔''

''اسلام علیکم'' میں نے گھر میں داخل ہوتے ہی چوکی پہ بیٹھ کے حقہ گڑگڑاتے ابا کو سلام کیا۔

''پترا تنے خشوع وخضوع سے انھیں سلام کیا کرو جو تیرے کرتوتوں سے ناواقف ہوں۔'' ابا کا لہجہ خوشگوار تھا۔

''نہیں ابا سلام کرنا میرا حق ہے...... آخر آپ میرے والد ہیں''

''والد تو پتا نہیں ہوں کہ نہیں۔ تیری اماں کا شوہر ضرور ہوں۔ البتہ تیرے سلام کے پیچھے کوئی چکر ضرور ہے۔ کہیں جیب خرچ مانگنے کا ارادہ تو نہیں ہے تیرا؟''

''نہیں ابا دراصل وہ......؟''

''ہاں ہاں کہو؟'' ابا ایسے لہجے میں بولا جس کا صریح مطلب یہی تھا کہ ذرا کہہ کے دیکھو۔

''وہ......شادی......لڑکی کا باپ......رشتا......'' میں گڑبڑا گیا تھا۔

''ہاں، بتاؤ کون ہے؟ کس کی بیٹی ہے؟'' ابا کی رنگت جو سیاہ سے سیاہ ترین ہوتی جارہی تھی پرابلم کو ٹلتا دیکھ کر اپنی قدرتی حالت پہ آ گئی۔ اور ابا کے چہرے پر زردی نمودار ہوئی جوان کے دانتوں کی تھی۔

''حوالدار بشیر کی بیٹی۔۔۔ شادو''

''ہائیں!'' ابا حقیقتاً اچھل پڑا۔ ''اسی لیے تو بھرتی کے لیے بے تاب ہورہا تھا۔ کہیں تو بھرتی کے لیے گیا تو نہیں تھا؟''

''میں پاگل تھوڑا ہوں کہ بھرتی کے لیے جاتا؟''

''تھوڑا نہیں تو مکمل پاگل ہے۔'' ابا دھاڑا۔ ''مجھے بخشو ملا تھا اور کہہ رہا تھا کہ تم نے آج بھرتی کے لیے جانا ہے۔''

''ب۔۔۔ بخشو...... آپ سے ملنے کیسے آ سکتا ہے؟'' میں ہکلایا۔ ''وہ تو اس راہ سے بھی نہیں گزرتا جس پہ آپ کے پاؤں پڑ چکے ہوں۔''

''میں خود اس کے پاس گیا تھا۔ تمھاری تائی کا مرغا کل دوپہر کسی نے چوری کر لیا تھا۔ اور وہ مجھے کہہ رہی تھی کہ میں کچھ کوشش کروں شاید مل جائے۔ اس سلسلے میں، میں اس کے کھنڈر پر گیا تھا، مگر وہ لعین بالکل مکر گیا۔ خدا، رسول کے واسطے دینے لگا۔ مجھے ترس آ گیا خبیث پر اور میں کچھ کہے بنا واپس آ گیا۔''

مجھے پتا تھا کہ ابا کے کچھ نہ کہنے کا مطلب زبان سے کچھ نہ کہنا ہے۔ ہاتھ پاؤں اس سے مستثنیٰ تھے۔

”مجھے تو کچھ اور کہہ رہا تھا ؟“ میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا جو نشانے پہ لگا۔

”بکواس کرتا ہے“ ابّا نے منہ بنایا۔ ”یہ گھڑی تو زبردستی اس نے میرے حوالے کر دی کہ مرغا مل گیا تو واپس لے لوں گا۔“ ساتھ ہی ابّا نے کلائی پر بندھی سنہرے ڈائل کی گھڑی میری آنکھوں کے سامنے لہرائی۔

”لازمی بات ہے اس کی جان سے تو قیمتی نہیں تھی نا یہ گھڑی؟“ میں ہولے سے بولا اور پھر ابّا کو متوجہ دیکھ کر زور سے بولا۔ ”بہر حال میں پاگل سہی، پر سو ل پاگل ہوں اور میرے ٹھیک ہونے کے چانس بہر حال موجود ہیں ......فوج میں جا کر میں یہ امید ختم نہیں کرنا چاہتا۔“

”ہا......ہا......ہا“ ابّا نے خوشی کا اظہار قہقہے سے کیا ”یہ بات کل تک تو تیری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی؟“

”آج تو آ گئی ہے نا“ اور دل میں سوچا۔ ”بھرتی کی شرائط پڑھ کر۔“

”ویسے ابّا بخشو سچا ہے، اس نے مرغا نہیں چرایا کیوں کہ کل وہ سارا دن میرے ساتھ تھا۔“

”تم مجھ پہ الزام لگا رہے ہو ؟“ ابّا کا پارہ پھر بلند ہو گیا ”اگر وہ بے گناہ ہے تو نے بھی نہیں چرایا تو پیچھے تو میں ہی بچتا ہوں اس محلے میں جو یہ کام کر سکتا ہے۔“ میں نے چپ سادھ لی کہ ابّا میرے مسئلے پہ تو آ ہی نہیں رہے تھے کہ شادو (دختر حوالدار بشیر) کو پھنسانے کی کوئی ترکیب بتا دیتے۔

”اور ہاں تم حوالدار بشیر کی بیٹی کی بات کر رہے تھے، اس کا مطلب تو یہی ہوا کہ تمھارا مرض لا علاج ہو چکا ہے؟ اس کے علاوہ تجھے کوئی لڑکی نہ ملی علاقے میں؟ اس کا کردار تو پنجابی فلم کی ہیروئن سے بھی خراب ہے اور حوالدار بشیر خود ہماری منتیں کر رہا ہے کہ کوئی اچھا سا رشتا اسے بتائیں تا کہ وہ اس سے جان چھڑا سکے، تین درجن کارتوسوں میں سے اڑھائی درجن تو وہ اپنی بیٹی کے عاشقوں پر ضائع کر چکا ہے اور ادھر صاحبزادے خود اوکھلی میں سر دے رہے ہیں۔“

”بکواس کرتا ہے وہ“ میں چلایا ”وہ اس کی بیٹی کے نہیں اس کی دوسری بیوی کے کچھ لگتے ہیں، مجھے بھی بلایا تھا اس نے اور بڑی مشکل سے بچا تھا میں حوالدار کے فائر سے، البتہ اس کی سوتیلی دختر نیک اختر کی نظروں سے گھائل ہو گیا۔ تین ہفتوں کی نائیٹ پریڈ کے بعد کہیں جا کر اس نے لفٹ کرائی ہے۔ حوالدار تو باتھ روم بھی بیوی سے پوچھ کر استعمال کرتا ہے اسی لیے بیوی کے کہنے پر اس نے اپنی نیک سیرت بیٹی کو ایسا ویسا سمجھ رکھا ہے

۔حالانکہ یہ اس کی بیوی کی چال ہے وہ اپنے یاروں کا الزام اپنی سوتیلی بیٹی کے سر تھوپ دیتی ہے تاکہ حوالدار بشیر اس پہ شک نہ کر سکے۔" میں سانس لینے کے لیے رکا اور پھر بات جاری رکھی۔

"آپ کو حوالدار بشیر نے اچھے رشتے کا کہا ہوا ہے تو آپ اسے میرے بارے بتا دیتے ناں؟"

"اچھے رشتے کا کہا ہے بھوکا نہیں مارنا اس نے بیٹی کو تجھ جیسے کنگلے کے حوالے کر کے۔"

"کیوں؟ میں کسی سے کم ہوں کیا؟" میں نے چھاتی پھیلائی "ہاشم جان جٹ کا بیٹا، بارہ بھائیوں کا اکلوتا بھائی اور کون سا اچھا رشتا چاہیے اس عقل کی بیماری کو؟"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" ابا کے چہرے پر اس دفعہ زرد اور بینگنی دونوں رنگ جھلکے (کیونکہ زیادہ مسکراہٹ کی وجہ سے پیلے دانتوں کے ساتھ بینگنی مسوڑھے بھی نمودار ہو گئے تھے) "لیکن تم سے بڑے بھائی بھی تو اب تک موجود ہیں۔"

"ابا میں نکاح یا منگنی کا کہہ رہا ہوں شادی بعد میں ہو جائے گی یوں بھی میرے کھیلنے کودنے کے دن ہیں؟"

"لیکن اس شرط پر کہ تم مرغے کا چور ڈھونڈ لاؤ" ابا نے نہایت آسان سی شرط بتلائی "تمھاری تائی نیک بخت مجھے کہہ رہی تھی کے چور ڈھونڈوں اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ اسے مجھ پہ شک ہے۔"

اور میں نے ڈیڑھ سو روپے جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھا کر فی الفور اس کی شرط پوری کر دی۔

"اڑھائی سو ملا تھا سو خرچ ہو گئے ہیں۔"

ابا نے جھپٹ کر پیسے پکڑے "اب شک کرتی رہے، دل تو مطمئن ہے ناں اور ہاں آئندہ خود بخود میرا حصہ پہنچا دیا کرو، یہ کوئی سمجھانے کی بات نہیں ہے، باقی میں تمھاری بات کروں گا حوالدار بشیر سے ماننا نہ ماننا، اس کی صوابدید ہے، البتہ تمھیں ایک کام کرنا پڑے گا" اتنا کہہ کر ابا مجھے سمجھانے لگ گیا۔

☆......☆......☆

"بخشو میرے یار تو نے قربانی دینی ہے" میں بخشو کی کال کوٹھی میں تین ٹانگوں والی کرسی پر سنبھل کر بیٹھا ہوا تھا جبکہ وہ سامنے اپنی چارپائی پر سینے تک چادر اوڑھے لیٹا تھا اور اس کے انگ انگ سے ابا کے سمجھانے کے ثبوت مل رہے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں ابا کی مہارت پر اسے سراہا...... ایسی ٹیکنیکس تو تھانیداروں کے

پاس بھی نہیں ہوتی۔ کہ زخم کا نشان بھی نہ رہے اور بندے میں جان بھی نہ رہے۔

''بھائی صاب!...... کسی قصائی سے رابطہ کرو'' بخشو نے کراہتے ہوئے کہا۔''میرے جسم میں تو ہلنے جلنے کی بھی سکت نہیں ہے۔''

''دیکھو پہلے یہ کام صرف تو ہی کر سکتا ہے۔میں تجھے ساری صورت حال سے آگاہ کر چکا ہوں۔''

''ناممکن۔'' بخشو نے انکار میں سر ہلایا۔''اس کے پاس بارہ بور بندوق تو ہے عقل نہیں ہے۔''

''اگر یوں ہے تو میں آج ملوں گا حوالدار بشیر سے اور اسے بتاؤں گا کہ تم اس کی دوسری بیوی کو چھیڑتے ہو۔''

''ایسے ہی کسی ثبوت کے بغیر...... آہ'' بخشو چارپائی پر اچھل کر سیدھا ہوا تو اس کی آہ نکل گئی۔

''ثبوت...... ہا...... ہا...... ہا......'' میں نے قہقہہ لگایا۔''کوئی بھی برا کام تم سے منسوب کرنے کے بعد ثبوت کے طور پر تمھارا چہرہ دکھانا کافی ہے۔''

بخشو کے چہرے پہ نظر آنے والے فکر مندی کے آثار دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ میرا تیر نشانے پہ لگا ہے۔

''تت...... تم اس طرح نہیں کر سکتے؟'' اس نے کمزور سے لہجے میں احتجاج کیا۔

''شادو کے لیے میں تجھے زہر بھی کھلا سکتا ہوں، تیرے سارے کرتوت اپنے تھانیدار بھائی کو بھی بتا سکتا ہوں اور ابا کو تیرے ان خیالات سے بھی آگاہ کر سکتا ہوں جو تیرے دل میں اس کے خلاف پوشیدہ ہیں۔''

''باقی تو سب ٹھیک ہے...... کیا نسرین بی بی مان جائے گی؟'' (نسرین حوالدار کی دوسری بیوی کا نام تھا)

''کیوں نہیں'' میں نے اسے تسلی دی ۔''تو نے سنا نہیں کسی نے کیا خوب کہا ہے؟''

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں

''دیر صرف تمھاری طرف سے ہے، اس کی طرف سے پکی ہاں سمجھو۔''

یہ سنتے ہی بخشو کا چہرہ اور بھیانک نظر آنے لگا، اس کے نقوش عجیب انداز میں پھیل گئے۔اس کا مطلب تھا بخشو مسکرا رہا ہے اور یہ دیکھتے ہوئے میں نے مطمئن انداز میں سر ہلا دیا۔

☆......☆......☆

منصوبے کے مطابق اس رات بخشو گیارہ بجے نسرین بی بی کے پاس پہنچ گیا نہ جانے وہ کس کا انتظار کر رہی

تھی، بہر حال کوئی بھی ہو بوڑھے خاوند کی جوان بیوی نے تو دل بہلانا ہی تھا۔ وہ کیا کہتے ہیں.......

ع   تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

پھر بخشو نے اس بھیانک انداز میں اظہارِ عشق کیا کہ مردے بھی اٹھ جاتے حوالدار تو صرف سویا ہوا تھا، بھاگتے وقت بخشو نے یہ عقلندی کی کہ یہ نعرہ لگاتے ہوئے بھاگا.......

"شادو پرسوں....... میں مولوی صاحب سے بات کر چکا ہوں۔"

اگلی رات ایک بجے کے قریب میں نے چکر لگایا اور ایک رقعہ بھی چھوڑ آیا جس میں شادو کو بھاگنے کا طریقہ کار سمجھایا گیا تھا۔

اس سے اگلے دن ابا نے حوالدار بشیر سے بات کی اور وہ بغیر کسی جھجک کے مان گیا۔ "تمھاری اپنی بچی ہے ہاشم جان جتنی جلدی ہو سکے اپنے گھر لے جاؤ، اب تو کارتوس بھی ختم ہو چکے ہیں۔"

"کارتوس؟" ابا کے لہجے میں حیرانی تھی۔

"آں....... ہاں" وہ گڑبڑا کے بولا "دراصل جوان بیٹی گھر میں ہو تو لچے لفنگوں کا تو خطرہ رہتا ہے نا! اور میں اپنے سارے کارتوس بھیڑیوں کے شکار پہ ختم کر چکا ہوں۔"

ابا کو بھی معلوم تھا کہ حوالدار بشیر کن بھیڑیوں کی بات کر رہا ہے مگر ہنس کر خاموش ہو گیا اور اس کے ایک دن بعد شادو کی انگلی میں میری منگنی کی انگوٹھی پڑ گئی، غالباً آپ کو یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں کہ یہ ترکیب ابا نے ہی بتائی تھی کہ حوالدار بشیر کو اس اسٹیج تک لے آؤ کہ اسے میرے متعلق سوچنے اور چھان بین کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے کیونکہ اگر اس نے تھوڑی سی بھی چھان بین کر لی تو وہ مجھے شادو کا رشتہ دینے کی بجائے اسے خود ہی بھگا دے گا۔

بزرگ بہر حال بزرگ ہوتے ہیں اور ہمیں ان کے تجربے سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

✿.......✿.......✿